فیض احمد فیضؔ

ورق ورق

یعنی

فیض احمد فیضؔ کے پانچ شعری مجموعوں، نقشِ فریادی، دستِ صبا،
زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ اور سرِ وادیٔ سینا کا گلدستہ معہ کلامِ متفرق۔

امرتسر
آزاد بک ڈپو

کلاسیکی ادب ۔ ۱ مرتبہ : کرشن کانت

آغاز

[illegible] زبوں حالی کے زمانہ میں کسی مہتم بالشان اشاعتی پروگرام کا اعلان [illegible] حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم بات ہوگی۔ اس ادبی کساد بازاری کے باعث کئی پبلشرز اپنا کاروبار ترک کرکے دیگر مفید دھندے اپنا چکے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر ادباء نے مختلف علاقائی زبانوں کی پناہ اختیار کر لی ہے۔ اُردو کے کہنہ مشق خطاط یا تو آنجہانی ہو چکے ہیں، یا پیرانہ سالی کے باعث گوشہ نشین، اور نئی پود اس فنِ شریف کو جنسِ کاسد تصور کرتی ہے۔ اُردو کی اکثر مستند تصانیف روز بروز بازار سے کالعدم ہوتی جا رہی ہیں۔ دیگر جو دستیاب بھی ہوتی ہیں، اُن میں بیشتر کی کتابت بدنما ہوتی ہے۔ اور طباعت ناقص اور متن میں اغلاط کی بھرمار پائی جاتی ہے۔

متذکرہ بالا صورتِ حالات کے پیشِ نظر دو اشاعتی سلسلوں کا اعلان کیا جاتا ہے:-

۱۔ کلاسیکی ادب ۲۔ نئی تحریریں

"کلاسیکی ادب" کے تحت اُردو کے شعری اور نثری سرمایہ سے معیاری، مستند اور زندۂ جاوید تصانیف مکمل، ملخص یا منتخب صورت میں سوانحی اور تنقیدی مقدموں کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

"نئی تحریریں" سلسلہ میں جدید ادب کی وہ شعری، افسانوی اور تنقیدی تصانیف پیش کی جائیں گی جو آج کے دانشوروں کے درمیان غور و فکر اور بحث و تمحیص کا موضوع بن چکی ہیں۔

ان دونوں سلسلوں میں چھپنے والی کتابوں کی کتابت، طباعت اور جلد بندی معیاری قسم کی ہوگی اور قیمت مناسب۔ تصانیف کے انتخاب اور پیشکش اور متن کی صحت وغیرہ کے معاملہ میں اُردو کے مشہور اہلِ قلم کا تعاون حاصل کیا جا رہا ہے۔

اس پروگرام کے لئے ہمیں کسی قسم کی سرکاری یا غیر سرکاری امداد کا انحصار نہیں ہے۔ لیکن ہمیں قوی یقین ہے کہ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والا طبقہ پنجاب کے واحد اُردو اشاعتی ادارہ کی حوصلہ افزائی سے اغماض نہیں کرے گا ــــ !!

موہن [illegible] ہان
(مالک آزاد بک ڈپو)

[illegible]یلکس ایڈیشن
سردار موہن سنگھ چوہان نے [illegible] پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر آزاد بک ڈپو ہال بازار امرتسر سے شائع کیا۔

مندرجات

نقشِ فریادی : ۱۹۴۱ء

دستِ صبا : ۱۹۵۲ء

زنداں نامہ : ۱۹۵۶ء

دستِ تہِ سنگ : ۱۹۶۴ء

سرِ وادیٔ سینا : ۱۹۶۸ء

متفرقات

~~۱۱۵۰~~

~~۲۱۴۹~~

مقدّمہ

اِس قحط الرّجال کے زمانہ میں فیض احمد فیضؔ اُن معدودے چند شخصیتوں میں سے ہیں، جن کا دم اُردو ادب کے لئے غنیمت ہے، بلکہ جن کی ذات سے اُردو شاعری کی آبرو قائم ہے۔

فیضؔ ۱۹۱۲ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ لاہور سے انگریزی اور عربی میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں انگریزی کے لکچرار تعیّنات ہوئے۔ دُوسری جنگِ عظیم کے دوران "فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لئے" فوج میں ملازمت کی۔ تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان ٹائمز کے مدیر رہے۔ "راولپنڈی سازش کیس" کے سلسلہ میں مارچ ۱۹۵۱ء سے اپریل ۱۹۵۵ء تک کا زمانہ دیگر سیاسی قیدیوں کے ساتھ سرگودھا، لائلپور، حیدرآباد (سندھ) اور منٹگمری کی جیلوں میں قید و بند کی جملہ صعوبتوں کے درمیان گزارا۔ بھارت، روس، انگلستان اور دیگر ممالک کا متعدد بار سفر کیا۔ روسی حکومت نے ان کی نظموں کے ترجمے شائع کئے۔ اور بین الاقوامی لینن امن انعام سے انہیں سرفراز کیا۔ اب تک اُن کے کلام کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ، اور سرِ وادیٔ سینا۔

فیضؔ کا محبوب "موضوعِ سخن" کیا ہے؟ فیضؔ نے اِسی عنوان کی ایک نظم میں اِس کی وضاحت کی ہے۔ اور اپنے دو محبوب موضوعات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ حدیثِ حسن و عشق اور محنت کش طبقہ کی ترجمانی۔ اس نظم میں حُسن و عشق کے معاملہ میں انہوں نے لذّتیت سے کام لیا ہے۔ اِس سے بعض نقّادوں کو یہ گمان گزرا ہے کہ یہی ان کا اصل موضوع ہے، اشتراکی خیالات کی نوعیت ثانوی بلکہ رسمی قسم کی ہے۔ حالانکہ فیضؔ نے اِس نظم میں جہاں حدیثِ دلبری کا بیان چٹخارے سے کیا، وہاں کسان، مزدور، اور متوسط طبقہ کے بیان میں درد و سوز کی انتہا ملتی ہے۔ اِنہی دو موضوعات کا اشارہ قریباً تیس سال بعد لکھی نظم "سوچنے دو" میں بھی ملتا ہے۔ لیکن ان نظموں سے کہیں زیادہ سوز و گداز اُن کی نظم "انتساب" میں ہے، جہاں انہوں نے دُکھتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق کی زبوں حالی کا ذکر بڑے درد بھرے لہجہ میں کیا ہے۔

فیضؔ کی شاعری کی ابتدا حُسن و عشق سے ہوتی ہے۔ "نقشِ فریادی" کے پہلے نصف حصہ کے منظومات کا بالغ موضوع یہی ہے۔ مگر جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے، "میری محبوب نہ مانگ" سے غمِ جاناں اور غمِ دوراں "ایک ہی

تجربے کے دو پہلو" بن جاتے ہیں۔ چنانچہ جوں جوں ہم تاریخی ترتیب سے فیض کا مطالعہ کرتے ہیں، فرہاد موئے قلم ترک کرکے تیشہ بدست دکھائی دیتا ہے۔ اور نقاشی سنگتراشی میں ضم ہوتی نظر آتی ہے۔

فیض کی شاعری نے ۱۹۲۸ء کے ارد گرد آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک طرف غزل گو فکر و شعور کے سبھی دریچے بند کرکے اپنی ذات کے اندر گم تھے، تو دوسری طرف رومان نگار شعراء ان دریچوں سے پرواز کرکے حدِ نظر سے ماوراء ایک نئی دُنیا میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ الارض للّٰہ سے اگر کسی شاعر کا رشتہ بندھا تھا تو وہ اقبال اور جوش ہی تھے۔ فیض نظریاتی اعتبار سے اشتراکی ہیں۔ اُردو کے روایتی شعراء کے برعکس اوائلِ عمر ہی سے ان پر کھُل گیا تھا کہ "اپنی ذات کو باقی دُنیا سے الگ کرکے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں۔۔۔ اور اگر ہو بھی تو انتہائی غیر سُود مند فعل ہے۔" اُن کا عقیدہ ہے کہ "قدرت کے بے بہا ذخائر پیداوار بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکینِ ہوس کے لئے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں لائے جانے چاہئیں۔" وہ فن کو نِرا مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ مجاہدہ بھی شمار کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدّ و جہد کا ادراک اور اِس جدّ و جہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو ہے۔ اور فنّی جدّ و جہد اِسی جدّ و جہد کا ایک پہلو ہے۔" اور اُن کا ایمان ہے کہ "سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود" ہم کامیابی کی شاہراہ پر مسلسل آگے بڑھتے جائیں گے۔

لیکن زندگی اور فن کے بارے میں ایک بیدار شعور رکھتے ہوئے بھی، ترقی پسندی کی تحریک کے آغاز میں جب ایک طرف کچھ لوگ مارکسیت کی برہنہ مشعلیں ہاتھوں میں لئے، عوامی اپیل کے نام پر سپاٹ، صریح اور غیر فنی نعرہ زنی پر اُتر آئے اور دوسری جانب بعض دیگروں نے انفرادیت کی آڑ میں آزاد تلازمہ خیال، داخلی ربط اور نجی علامتوں کے استعمال سے شاعری کو عملی نفسیات کا موضوع بنا دیا، فیض نے ایک متوازن اور معتدل راستہ ہی اختیار کیا۔ ایک طرف تو انہوں نے اُردو شاعری کی لغوی اور فنی روایات کو پیشِ نظر رکھا۔ اور اگر کہیں اِس سے انحراف کیا بھی تو صرف اس قدر کہ دوسروں کے ذہن کو ناخوشگوار دھچکا نہ لگے اور دوسری جانب جدید امریکی اور فرانسیسی شعراء کے اِبہام سے قطع نظر کرکے غزل کے عملِ تعمیم کو اپنے تجربوں کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔

اپنے پیشرو اور ہم عصر شعراء سے فیضؔ کئی اعتبار سے ممیز اور مختلف ہیں۔ اور اسی امتیاز اور اختلاف سے اردو شاعری میں اُن کے مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ فیضؔ میں وہ بیمار دروں بینی سرے سے مفقود ہے، جو اپنے ہی زخم چاٹ کر لذّت کا اکتساب کرتی ہے۔ اور جو اردو غزل کی بہترین روایات میں شمار کی جاتی ہے۔ غزل کی مخصوص فضا، علائم اور کنایاتی لہجہ کو بروئے کار لانے کے باوجود فیضؔ کا کلام عصری مسائل کا ایک خوبصورت آئینہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں حسرتؔ کے کلام میں "مہراج تلک" اور "چکی کی مشقت" کے ذکر کے علاوہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی نزاع کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اور جگرؔ کی شاعری جب داغؔ اور میرؔ کا دامن چھوڑ دیتی ہے تو سپاٹ صحافت بن کر رہ جاتی ہے۔

فیضؔ کے علاوہ جوشؔ، مجازؔ، سردارؔ جعفری اور کیفیؔ کے کلام میں بھی سرمایہ داری کے استبداد، ہنگامی سیاست کی ریشہ دوانیوں، پرولتاری طبقہ کی زبوں حالی اور حالات کو بدل دینے کے عزم کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگر جوشؔ اور مجازؔ کے ہاں شاعری سے زیادہ خطابت ہے۔ ان کے کلام میں لفظوں کی بھرمار اور تکرار سے قاری کا سر چکرانے لگتا ہے۔ ان کی متعدد نظموں میں نظم کے تعمیری ارتقاء کا تصوّر مفقود ہے۔ اکثر مقامات پر بند کے بند اُٹھا دینے سے نظم کی مجموعی ہیئت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جذبات کی شدت اور اظہار کی ہیجانی کیفیت کے اعتبار سے یہ لوگ رومانی شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں فیضؔ کی نظموں میں ضبط، اعتدال اور تعمیری حُسن کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ہر نظم اپنی تراش کے لحاظ سے ایک حسین مجسّمہ کی مانند ہمارے تصوّر کے سامنے اُبھرتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ ہمارے قلب و نظر میں مسرّت اور بصیرت کا ایک ابدی تاثر پیدا کرتی ہے۔ فیضؔ مختلف اور متناقض تشبیہوں اور استعاروں سے ہمیں پریشان نہیں کرتے۔ اور نہ ہم معنی الفاظ کے سیلاب سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خیالات کی چیخ و پکار، جذبات کی فراوانی اور متناقض اسالیب اور بیانات سے وہ نظم میں بد نظمی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اور یہی باتیں جوشؔ اور مجازؔ کا طرۂ امتیاز ہیں۔

سردارؔ جعفری اور کیفیؔ اعظمی کی شاعری کو منظوم صحافت کہنا زیادہ درست ہوگا۔ فکر کی جولان گاہ میں یہ لوگ جس تجربے سے دوچار ہوتے ہیں، اُسے بجنسہٖ کاغذ پر اُتار دیتے ہیں۔ فارسی کی

حسین تراکیب کے استعمال سے قطع نظر ان کا اظہار مستقیم اور اکہرا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس فیض کا ہر تجربہ پہلے اُن کے فکر و نظر کے نہاں خانوں میں پرورش پاتا ہے۔ اور پھر اُن کی شخصیت کے سارے عناصر اپنے اندر سمونے کے بعد ایک فن پارہ کے رُوپ میں صفحۂ قرطاس پر جلوہ آرا ہوتا ہے۔

جیسا کہ اُوپر ذکر ہو چکا، فیض کو بین السطور دیکھنے سے اُن کے اُردو، فارسی اور مغربی ادب کے عمیق مطالعہ کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اُردو فارسی کی کلاسیکی روایات میں جہاں ہم تعمیم اور کنایہ کے اختصار سے دوچار ہوتے ہیں، وہاں خیال اور اظہار میں شدید مبالغہ کی ریل پیل بھی نظر آتی ہے۔ شاعری میں خصوصاً قصیدہ کے اثر سے اور جدید رومانوی تحریک کے فیض سے یہ رُجحان نئی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ اس کے برعکس جدید امریکی اور انگریزی نظموں کی خصوصیت اُن کا ضبط و توازن اور مرکزیت ہے۔ فیض نے جہاں اپنے کلام میں غزل کی صوری روایات کا بھرپور استعمال کیا ہے وہاں نظم کے تعمیری حُسن اور مرکزیت، اور اظہار کے ضبط و توازن کے معاملہ میں مغربی شاعری کے بہترین نمونوں کو بھی اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔

فیض کے منظومات میں ہم جس واحد متکلم سے دوچار ہوتے ہیں، بادی النظر میں وہ اُردو کے روایتی عاشق سے زیادہ مختلف دِکھائی نہیں دیتا۔ مگر بہ نظرِ تعمق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی لباس میں ملبوس دو اشخاص بُعد القطبین شخصیتوں کے مالک ہیں۔ جہاں اُردو کا روایتی عاشق محبوبِ ہرجائی کے مسلسل ظلم سہنے کے بعد اذیت پسندی کا باقاعدہ مریض بن چکا ہے، اور لذتِ آزار کے بغیر اُسے اپنی زندگی بے معنی لگتی ہے، فیض کے عاشق کو زمانہ کے جَور و ستم نے زندگی کے بارے میں بصیرت بھی بخشی ہے۔ اور ایک نئے دَور کے آغاز کی بشارت بھی۔ چنانچہ وہ صبر کے سہارے فریاد کے اِن تھوڑے سے دِنوں کو گزار دینا چاہتا ہے۔ فیض کے ہاں نئے دَور کی یہ بشارت ایک رومانی نعرہ کی صورت میں نہیں ہے۔ بلکہ ایک باشعور مشاہدہ اور فکر کی پیداوار ہے۔ اُن کے دِل میں اُن قوتوں کا احترام ہے جو اِس دَور کے آغاز کے لئے مخالف قوتوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور وہ اُن مخالف قوتوں سے بھی واقف ہیں جو اِس ارتقاء کے راستہ میں ہر قسم کی

رکاوٹیں پیدا کرنے پر آمادہ رہتی ہیں۔ مگر اُن کی محبت اور نفرت پر اُن کے فنی اور ادبی شعور کا حیرت انگیز ضبط ہے۔ حالانکہ اِنہی نظریوں کی خاطر انہوں نے اپنی عمرِ عزیز کے آٹھ سال پاکستانی جیلوں میں شدید سختیوں کے درمیان گذارے ہیں۔ دستِ صبا اور زنداں نامہ کلیتاً اور دستِ تہِ سنگ کا بیشتر حصّہ اِسی عہدِ اسیری کی یادگار ہے۔

سرسری مطالعہ میں فیض کی غزلیں میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ کی غزلوں سے مختلف معلوم نہیں ہوتیں۔ کیونکہ دونوں میں اظہار کے پیانے اکثر و بیشتر مماثل ہیں۔ لیکن اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیض نے اردو غزل پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اُن کی غزلوں میں پرانی علائم کے پسِ پردہ دورِ جدید کے سیاسی، ثقافتی اور عمرانی شعور کا احساس و اظہار تو مِلتا ہی ہے۔ اُنہوں نے اکثر پُرانے علائم سے قطع نظر کرکے نئی نئی تشبیہوں، اِستعاروں اور علامتوں کی بھی تخلیق کی ہے۔ اور تشبیہ منقلب کی مغربی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔ جس میں ایک شئے سے متعلق خصوصیات سے کسی دوسری شے کو متصف کر دیا جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ اصغرؔ اور فانیؔ کے برعکس فیض کے کلام میں حیات و کائنات کے بنیادی مسائل کا کوئی نشان نہیں ملتا، ایک بے معنی سی بات ہے۔ اصغرؔ اور فانیؔ کے کلام میں زندگی اور انسانی وجود سے متعلق جو خیالات ملتے ہیں، اُنہیں کچھ اِنہی شعراء سے نسبت نہیں ہے۔ وہ ایک مخصوص معاشرہ کے مخصوص اور ہمہ وقت مسلّمہ خیالات و عقائد ہیں۔ میرؔ، دردؔ، غالبؔ اور دیگر شعراء کے ہاں بھی اِسی قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ لیکن جو چیز ہمیں فیضؔ کے ہاں مِلتی ہے، وہ اِن شعراء کے کالاؤنڈزدا سے مختلف ہے۔ اور وہ ہے زندگی کی کشمکش کا شعور، زندگی کے گھناؤنے سکون سے نفرت اور زندگی کے تابناک مستقبل سے محبت ـــــ اور اِسی کے اظہار کے لئے فیضؔ نے غزل کی ساری روایات کا استعمال کیا ہے۔

بھارت میں جہاں اُردو کس مپرسی کے عالم میں ہے،

نئی نسل فیضؔ کے کلام کو سُرمہ سمجھ کر آنکھوں سے لگاتی ہے۔ محنت و سرمایہ کی کش مکش کا شعور جوں جوں عوام میں بڑھتا جائے گا، آنے والی نسلیں اسے ایک اہم تاریخی اور فنی دستاویز کے طور پر حرزِ جاں بنائیں گی۔

کرشن کانت

۲۲ر دسمبر ۷۵ء
محلّہ شوکوٹ
بٹالہ (پنجاب)

فیض از فیض

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اِس لئے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے، اِس انگریزی لفظ کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ لیکن اب تو ہمارے ہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آنے لگے ہیں۔ اِس لئے اب اُسے اردو روزمرہ میں شامل سمجھنا چاہیئے۔ تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قیل وقال بُری لگتی ہے۔ بلکہ مَیں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا۔ اور "مَیں" کے بجائے ہمیشہ سے "ہم" لکھتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی سُراغرساں حضرات مجھ سے یہ پُوچھنے بیٹھتے ہیں، کہ تُم شعر کیوں کہتے ہو، کیسے کہتے ہو، اور کس لئے کہتے ہو۔ تو بات کو ٹالنے کے لئے جو دِل میں آئے کہہ دیتا ہُوں۔ مثلاً یہ کہ بھئی مَیں جیسے بھی کہتا ہُوں، جس لئے کہتا ہُوں، تُم شعر میں خود ڈھونڈ لو۔ میرا سَر کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اُن میں سے ڈِھیٹ قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمّہ داری اِن حضرات کے سَر ہے مجھ پر نہیں۔

شعر گوئی کا کوئی واحد عذرِ گُناہ تو مجھے معلوم نہیں۔ اِس میں بچپن کی فضائے گرد وپیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دِل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ "نقشِ فریادی" کے پہلے حِصّے کی بات ہے۔ جس میں ۲۹-۱۹۲۸ء سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک کی تحریریں شامِل ہیں۔ جو ہماری طالب علمی کے دِن تھے۔ یُوں تو اِن سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق

ہے۔ اور اس واردات کا ظاہری محرّک تو وہی ایک حادثہ ہے، جو اِس عُمر میں اکثر نوجوان
دِلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہُوں، تو یہ دَور بھی ایک دَور نہیں تھا۔
بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حِصّے تھے۔ جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی
مختلف تھی۔ وُہ یُوں ہے، کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی
اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسُودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا۔ جِس
میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ
کے بجائے کچھ رنگ رَلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اوّلاً حسرتؔ موہانی
اور اُن کے بعد جوشؔ، حفیظؔ جالندھری اور اخترؔ شیرانی کی ریاست قائم تھی۔ افسانے
میں یلدرم اور تنقید میں حُسن برائے حُسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ "نقشِ فریادی"
کی ابتدائی نظمیں، "خُدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تُو۔" "مری جاں اَب بھی اپنا
حُسن واپس پھیر دے مجھ کو۔" "تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں" وغیرہ وغیرہ اِسی
ماحول کے زیرِ اثر مرتب ہُوئیں۔ اور فضا میں ابتدائے عشق کا تحیّر بھی شامل تھا۔
لیکن ہم لوگ اِس دَور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے۔ کہ صحبتِ
یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہُوئے۔
کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک
پھانکنے لگے۔ یہ وہ دِن تھے، جب یکایک بچّوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اُجڑے ہُوئے
کِسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدُوری کرنے لگے۔ اور اچھی خاصی شریف
بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا۔ اور گھر کے اندر مرگِ
سوزِ محبّت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یُوں محسوس ہونے لگا، کہ دل و دماغ پر سبھی
راستے بند ہو گئے ہیں۔ اور اَب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اِس
کیفیّت کا اختتام جو "نقشِ فریادی" کے پہلے حِصّے کی آخری نظموں کی کیفیّت

ہے، ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے۔ جسے میں نے "یاس" کا نام دیا تھا۔

۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے۔ اور ۳۵ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہم عصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقاء صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔ مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا یہ تھا، کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس میں بہرحال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں۔ اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے۔ کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرّتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے، چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا "نقشِ فریادی" کے دوسرے حصّے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"۔

اس کے بعد تیرہ چودہ برس "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گزرے۔ اور پھر فوج، صحافت، ٹریڈ یونین وغیرہ وغیرہ کے بعد ہم چار برس کے لئے جیل خانے چلے گئے۔ "نقشِ فریادی" کے بعد دو کتابیں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ"

اسی جیلخانے کی یادگار ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انہی ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوا تھا۔ لیکن جیلخانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے۔ جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو یہ ہے۔ کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیّات یعنی SENSATIONS پھر تیز ہو جاتی ہیں۔ اور صبح کی پو۔ شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیّر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔ نزدیک کی چیزیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور دور کی نزدیک اور فردا و دی کا تفرقہ کچھ طور سے مٹ جاتا ہے۔ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے، اور کبھی ایک صدی کل کی بات، تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجّہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ اس جیل خانے کے بھی دو دور تھے۔ ایک حیدرآباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کے تحیّر کا زمانہ تھا۔ ایک منٹگمری جیل کا جو اِس تجربے سے اُکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا۔ اِن دو کیفیتوں کی نمائندہ دو نظمیں ہیں۔ 'زنداں کی ایک شام اور 'اے روشنیوں کے شہر' پہلی دستِ صبا میں۔ دوسری زنداں نامہ میں۔

زنداں نامے کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے۔ جس میں اپنا اخباری پیشہ چھٹا۔ ایک بار پھر جیل خانے گئے مارشل لاء کا دور آیا۔ اور ذہنی اور گردوپیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اِس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمّل غزل کے چند اشعار ہیں:-

کب ٹھہرے گا درد اے دِل کب رات بسر ہوگی

فیض

نظمیں

خُدا وہ وقت نہ لائے....

خُدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تُو
سُکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات، تجھے، تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دِل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رَہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رَہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رَہ جائے
غرورِ حُسن سراپا نیاز ہو تیرا
طویل راتوں میں تُو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کِسی غم گُسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنّا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جُھکے

کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لئے بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اِنتہائے کار

پندار کے خُوگر کو — ناکام بھی دیکھو گے ؟
آغاز سے واقف ہو — انجام بھی دیکھو گے ؟
رنگینئ دُنیا سے — مایوس سا ہو جانا
دُکھتا ہُوا دِل لے کر — تنہائی میں کھو جانا
ترسی ہوئی نظروں کو — حسرت سے جُھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو — آہوں میں چُھپا لینا
راتوں کی خموشی میں — چُھپ کر کبھی رو لینا
مجبُور جوانی کے — ملبوس کو دھو لینا

جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بَسا لینا
بُھولی ہوئی یادوں کو
سِینے سے لگا لینا

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دُنیا میں شام آچکی ہے
سِیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ اِلتجائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے سِتم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اَے میرے معصُوم قاتِل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دُعائیں

سرودِ شبانہ

گُم ہے اِک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حُسنِ معصُوم خوابِ ناز میں ہے

اَے کہ تُو رنگ و بُو کا طوفاں ہے
اَے کہ تُو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھُول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اَور ہے بہارِ شباب
آ کہ کچھ دِل کی سُن سُنا لیں ہم
آ، محبت کے گیت گا لیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرتِ دید نا تمام رہے؟

دِل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے

آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آکہ تھوڑا سا پیار کرلیں ہم
زندگی زرنگار کرلیں ہم

آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دُور نہیں ہے!
جب درد سے رُک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گذر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نِگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مِرے آنسو، مِری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مِری بے کار جوانی

شاید مری اُلفت کو بہت یاد کروگی
اپنے دِلِ معصُوم کو ناشاد کروگی
آؤگی مِری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھُول چڑھانے

شاید مِری تُربت کو بھی ٹھکرا کے چلوگی
شاید مِری بے سُود وفاؤں پہ ہنسوگی

اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا
لیکن دِلِ ناکام کو احساس نہ ہوگا

القصّہ مآلِ غمِ اُلفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو، فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو، تمہیں یا کہ مسرّت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ اُلفت

حسینۂ خیال سے

مجھے دے دے
رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اِک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اِک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لئے اِس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیاءِ حُسن سے ظلماتِ دُنیا میں نہ پھر آؤں
گذشتہ حسرتوں کے داغ میرے دِل سے دُھل جائیں
مَیں آنے والے غم کی فِکر سے آزاد ہو جاؤں
مِرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اِک نظر، اِک جاوِدانی سی نظر دے دے

(براؤننگ)

مِری جاں اَب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مُجھ کو
ابھی تک دِل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
تِرے جلوؤں سے بزمِ زندگی جنّت بدامن ہے
مِری رُوح اَب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اِک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اَب بھی
ہر اِک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نِگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اَب بھی
مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟
تری بے مہریوں پر جان دے گی آخرش کب تک؟
تِری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مری دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دُھندلائی ہوئی آنکھیں
تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی

پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذّت نہ پائیں گے
گلو میں تیری اُلفت کے ترانے سُوکھ جائیں گے

مبادا یادہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجہائے غم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صُورت دُھل کے بہہ جائے
حریمِ عشق کی شمعِ درخشاں بُجھ کے رہ جائے
مبادا اجنبی دُنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو!
مری جاں اَب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو

بعد از وقت

دِل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا
اپنے معصُوم تبسّم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گُلبار نہ کر دینا تھا
شوقِ مجبُور کو بس ایک جھلک دِکھلا کر
واقفِ لذّتِ تکرار نہ کر دینا تھا
چشمِ مشتاق کی خاموش تمنّاؤں کو
یک بیک، مائلِ گُفتار نہ کر دینا تھا
جلوۂ حُسن کو مستُور ہی رہنے دیتے
حسرتِ دِل کو گنہگار نہ کر دینا تھا

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بُود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجُم فسُردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سُو بےخودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوق و نیاز
سازِ دِل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا رُوئے حسیں

اِنتظار

گُزر رہے ہیں شب و روز تُم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزُردۂ بہار ابھی
مِرے خیال کی دُنیا ہے سوگوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اُداس آنکھیں تری دید کو ترستی ہیں
بہارِ حُسن پہ پابندیٔ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟
قسم تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب، آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

تہِ نجوم

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اِک دِل ہے بیقرار ابھی
خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اِک بُنِ مُو سے
رَواں ہو برگِ گُلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اُڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے
اُداس آنکھوں میں خاموش اِلتجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دُعائیں ہیں
تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حُسن ہے مصروفِ انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گُل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

حسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گل چیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے
کئی دلوں کی اُمیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحطِ عیش و مسرّت نہ غم کی ارزانی
کنارِ رحمتِ حق میں اُسے سُلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنّت کے پھول لاتی ہے

تین منظر

تصوّر

شوخیاں مضطر نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار میں
سُرخ ہونٹوں پر تبسّم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھُول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

سامنا

چھنتی ہُوئی نظروں سے جذبات کی دُنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنّائیں
کچھ اُلجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک، جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رُخصت

فسردہ رُخ، لبوں پر اِک نیاز آمیز خاموشی
تبسّم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بیکسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دُکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

سرود

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دُور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

ساقیا! رنج نہ کر جاگ اُٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اُٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت، مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ سفینہ اپنا

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے!
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصّہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

زحمتِ گریہ و بُکا بے سُود
شکوۂ بختِ نارسا بے سُود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزُول
بند ہے مدّتوں سے بابِ قبُول
بے نیازِ دُعا ہے ربِّ کریم

بُجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یادِ باقی ہے بیکسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ اُلفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصُول رہنے دے

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دُکھ سے بھرپُور دِن تمام ہوئے اور کل کی خبر کِسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدُود ہو نہ ہو اَب سحر، کِسے معلوم؟

زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات؟
ایزدیّت ہے ممکن آج کی رات!

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

اب نہ دُہرا، فسانہ ہائے اَلم اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اُتار دے دِل سے عُمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو

عہدِ غم کی حکایتیں مت پُوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پُوچھ

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

ایک رہگذر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں

شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں

ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں

سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش

گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد، جسے سروِ سہی نماز کرے

غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اِس رہگذر سے گذرا تھا
بصد غرور و تجمل، اِدھر سے گذرا تھا

اور اب یہ راہگذر بھی ہے دلفریب و حسیں
ہے اس کی خاک میں کیفِ شراب و شعر مکیں

ہوائیں شوخیٔ رفتار کی ادائیں ہیں
فضائیں نرمیٔ گفتار کی صدائیں ہیں

غرض وہ حسن بھی اب اس کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اِک سجدہ گہ میسر ہے

ایک منظر

بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور
آسمانوں سے جُوئے درد رَواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نُور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کُناں

میرے ندیم

خیال و شعر کی دُنیا میں جان تھی جن سے
وہ جن کے نُور سے شاداب تھے مہ و انجم

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ انتظار کی راتیں، طویل، تیرہ و تار

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
چلو، کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب

فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم؟
وہ پاسِ ضبط سے دِل میں دبی ہوئی آہیں
وہ نیم خوابِ شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم!
اُلجھ رہے ہیں پُرانے غموں سے روح کے تار
ہیں اِنتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!

مجھ سے پہلی سی محبّت مِری محبُوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبّت مِری محبوب نہ مانگ
مَیں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صُورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھّا کیا ہے؟
تُو جو مِل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یُوں نہ تھا، مَیں نے فقط چاہا تھا یُوں ہو جائے
اَور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سِوا
راحتیں اَور بھی ہیں وصل کی راحت کے سِوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طِلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہُوئے
جا بجا بِکتے ہوئے کُوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لِتھڑے ہوئے خُون میں نہلائے ہُوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسُوروں سے
لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دِل کش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجے
اَور بھی دُکھ ہیں زمانے میں، محبّت کے سِوا
راحتیں اَور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سِوا
مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبُوب نہ مانگ!

سوچ

کیوں میرا دِل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہُوں؟
چھوڑو میری رام کہانی
مَیں جیسا بھی ہُوں اچّھا ہُوں

میرا دِل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دُنیا ہے ساری
یہ دُکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تُو گر میری بھی ہو جائے
دُنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مُہلک ہے
اپنا ہو یا اَور کِسی کا
رونا، دھونا، جی کو جَلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سُکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے، دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں؟
اُن کا سُکھ آپس میں بانٹیں!
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں!

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھُوٹیں گے، خُون بہے گا
خُون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

رقیب سے

آکہ وابستہ ہیں اِس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اِس دِل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بھلا رکھی تھی دُنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گذرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی اِن آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نُور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تُو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رُخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عُمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ اُلفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟
جُز ترے اَور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی — یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے — اشک آنکھوں میں بِلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عُقاب — بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بِکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت — شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے — فاقہ مستوں کو ڈبونے کیلئے کہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پُوچھ — اپنے دِل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں، کوئی نہیں!
راہرَو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اِک راہگذار
اجنبی خاک نے دُھندلا دیئے قدموں کے سُراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کِواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر سِتم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمّت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دِن تھوڑے ہیں
اِک ذرا صبر، کہ فریاد کے دِن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں!
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہُوا درد
دِل کی بے سُود تڑپ، جسم کی مایُوس پُکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

مرگِ سوزِ محبّت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبّت منائیں ہم
آؤ کہ حُسنِ ماہ سے دِل کو جلائیں ہم

خوش ہوں فراقِ قامت و رُخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو سنائیں ہم

ویرانیٔ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم

پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دِل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

سلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں نہ جائیں کہ جائیں ہم

پھر دِل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سُنائیں ہم

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ اُن کا
جہاں بھر کی دُھتکار اُن کی کمائی
نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اِک دُوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دِکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دُنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذِلّت دِلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہِلا دے

بول...

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جِسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دُکاں میں
تُند ہیں شُعلے، سُرخ ہے آہن
کُھلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اِک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جِسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

اِقبال

آیا ہمارے دیس میں اِک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزلخواں گزر گیا
سُنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دِلوں میں اُتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نُما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
چند اِک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اِک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دِلوں میں مقیم ہے
اور اُس کی لَے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تُند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ، وحشتِ صَرصَر سے بے خطر
یا شمعِ بزم صُبح کی آمد سے بے خبر

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ، سُلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نِکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مُشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

اُن کا آنچل ہے، کہ رُخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اُس زُلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حُسنِ دِلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رُخسار پہ ہلکا سا وہ غازہ کا غُبار
صندلی ہاتھ پہ دُھندلی سی حِنا کی تحریر
اپنے افکار کی، اشعار کی دُنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟

اِن دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جِیا کرتی ہے؟

یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے؟

یہ ہر اِک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں جل بُجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اِک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں اَیسے کئی اَور بھی مضموں ہوں گے لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کُھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دِلآویز خطوط آپ ہی کہئے کہیں اَیسے بھی فسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سُخن ان کے سِوا اَور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سِوا اَور نہیں

ہم لوگ

دِل کے ایواں میں لئے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اُکتائے ہوئے
حُسنِ محبُوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

غایتِ سُود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سُود تجسّس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نِڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اِک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دِل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اِک اُلجھی ہوئی موہُوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

شاہراہ

ایک افسُردہ شاہراہ ہے دراز
دُور افق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹّی پہ اپنے سینے کے
سُرمگیں حُسن کو بچھائے ہوئے

جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصوّر میں
مُو بمُو چُور، عُضو عُضو نِڈھال

اے حبیبِ عنبر دست

(ایک اجنبی خاتون کے نام، خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر)

کسی کے دستِ عنایت نے کُنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دِل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زُلفِ یار کی صُورت
ہَوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گُلبدَن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست
لِئے ہے بُوئے رفاقت اگر ہوائے چمن!
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظُلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وُہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دِلوں کی فتح و شکست

یہ شعرِ حافظِ شیراز، اَے صبا! کہنا
مِلے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے، کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گِھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اِسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے، زرد پتے
گِرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے

یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اِسی سیاہی میں رُونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سُلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اَور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اِک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے!
جگر سے نوچے ہیں، اَور ہر اِک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۴۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھِل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی
ہاں، ہم ہی کاربندِ اُصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یُوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھُولے تو یُوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کُشتۂ غم اَور کیا نہ تھے؟

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خُوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گُریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیٔ مئے ایّام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

اَے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سُوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور اُفق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صُورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بستا ہے اِس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اَے روشنیوں کے شہر

کون کہے کِس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نُور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماندِ سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اَے روشنیوں کے شہر

۶۵

شبِ خوں سے مُنہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہدو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لَو

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زُلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھُلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دِل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اِس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کِس کو شِکوہ ہے گر شوق کے سِلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا مِلے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلَم
اَور نِکلیں گے عُشّاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطِر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دِلبری کا بھَرَم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لئے

کِسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کِسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کِسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کِسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دِن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہُو میں غرق مِرے غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دِن مِری نظروں کے سامنے ان کے
شہیدِ جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

درد آئے گا دبے پاؤں

اَور کچھ دیر میں، جب پھر مِرے تنہا دِل کو
فِکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لِئے، سُرخ چراغ
وہ جو اِک درد دھڑکتا ہے کہیں دِل سے پَرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھّے گا
دِل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھّے گا
حلقۂ زُلف کہیں، گوشۂ رُخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گُلشنِ دیدار کہیں
لُطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دِل سے پھر ہو گی مِری بات کہ اَے دِل اَے دِل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہو گا

مشتعل ہو کے ابھی اُٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہو گا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اَے دِل
دُشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اَور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اَے دِل

لاؤ سلگاؤ کوئی جوش و غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہُوا گلزار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
اُن کو شعلوں سے رَجَز اپنا پتا تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

Africa, come back.[1]

(ایک رَجز)

آجاؤ، مَیں نے سُن لی تِرے ڈھول کی ترنگ آجاؤ، مست ہوگئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ ایفریقیا"

آجاؤ، مَیں نے دُھول سے ماتھا اُٹھا لیا آجاؤ، مَیں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، مَیں نے درد سے بازو چھُڑا لیا آجاؤ، مَیں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
"آجاؤ ایفریقیا"

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گُرز گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے مَیں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقیا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین دُشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
"آجاؤ ایفریقیا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مِرے ساتھ ایفریقا دریا تھرک رہا ہے، تو بَن دے رہا ہے تال
"آجاؤ ایفریقیا"

مَیں ایفریقا ہوں، دھار لیا مَیں نے تیرا رُوپ مَیں تو ہُوں، میری چال ہے تیری، بَبر کی چال
"آجاؤ ایفریقیا"
آؤ بَبر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"

---

[1] افریقی حُرّیت پسندوں کا نعرہ۔

یہ فصلِ اُمیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب، سِسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بِلکتے مت چھوڑو
یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم
اِس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو

پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو!

پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اِک بار اُجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

بُنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو! فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا؟
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو

دشنام، نالہ، ہاؤ ہُو، فریاد، کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اَے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

یاد کی راہ گذر جس پہ اسی صورت سے
مُدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اَور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی مَیں ہُوں، نہ کوئی تم ہو

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کِس دم
تم پلٹ آؤ، گذر جاؤ، یا مُڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھُوٹ نِکلے گی وہاں اَور کوئی راہ گُزر
پھر اسی طرح جہاں ہو گا مقابل پیہم
سایۂ زُلف کا اَور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ، کوئی دشت، کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

اگست ۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے
لطف کر اے نگہِ یار کہ غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے
چاند دیکھا تیری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
مِلتی جُلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے
دِل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے
پھر سے بُجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

اَے دلِ بے تاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رُخسارِ سحر
صُبح ہونے ہی کو ہے اَے دلِ بے تاب ٹھہر!

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلقُ الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندئ آداب ابھی
اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانبارئ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

سیاسی لیڈر کے نام

سالہاسال یہ بے آسرا جکڑے ہُوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نُور نے اِک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صُبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اَور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہُوا دِن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

مرے ہمدم مرے دوست

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہُوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
روز و شب، شام و سحر، میں تجھے بہلاتا رہُوں
مَیں تجھے گیت سُناتا رہُوں ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیّاروں کے گیت
تجھ سے مَیں حُسن و محبّت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں

کیسے اِک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کِس طرح عارضِ محبوب کا شفّاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گُلچیں کے لئے جُھکتی ہے خود شاخِ گُلاب
کِس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یُوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطِر
گیت بُنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطِر

پر مرے گیت ترے دُکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غمخوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اَور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اِس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سِوا، تیرے سِوا، تیرے سِوا

صُبحِ آزادی

(اگست ۱۹۴۷ء)

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وُہ سحر تو نہیں
یہ وُہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پُکارتی رہیں باہیں، بدن بُلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نُور کا دامن

ٹپک ٹپک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نُور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بَدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستُور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دِل کی جلن
کِسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کِدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانئ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دِل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دِل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دَوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایّام ابھی اَور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

میخانہ سلامت ہے تو ہم سُرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دِل میں تو ہر اشک سے پَیدا
رنگِ لب و رُخسارِ صنم کرتے رہیں گے

یہ طرزِ تغافل ہے سو وُہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

شورشِ بربط و نے

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اَور نہیں، پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اَور کسی فردا کیلئے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کِس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
شیرینیِ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیِ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں اُلجھ کر کیا لیں گے
اِک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں، جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اِس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اِک طاق اگر ویراں ہے تو کیا

افسردہ ہیں گر ایّام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکُل ولب، شاداب وحسیں گلگشتِ نظر
مقسُوم ہے لذّتِ دردِ جگر، موجُود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اِس دیدۂ تر کا شکر کرو، اِس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اس شام وسحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز

۔ گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر، اِن شمس و قمر کا کیا ہوگا؟
رعنائیٔ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا؟
جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اِس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اِس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا؟
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اِس کلکِ گہر کا کیا ہوگا؟
جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا اور جیب و گریباں طوق ورسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اِس دردِ جگر کا کیا ہوگا؟

دوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اِس خُوں میں حرارت ہے جب تک

اِس دُنیا میں صداقت ہے، جب تک، اِس نُطق میں طاقت ہے، جب تک
اِن طوق و سلاسل کو ہم تم، سِکھلائیں گے شورشِ بربط و نَے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے
آزاد ہیں اپنے فِکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمّت کا
اِک عمر ہے اپنی ہر ساعت، اِمروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لَوح و قلم، یہ طبل و عَلَم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

دامنِ یُوسف

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اَے اہلِ مصر! وضعِ تکلّف تو دیکھئے!
اِنصاف ہے کہ حُکمِ عقوبت سے پیشتر
اِک بار سوئے دامنِ یُوسف تو دیکھئے!

طوق و دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیب صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایہ و سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے، ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں ہے، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

سرِ مقتل

(قوالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنّا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل؛ جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صدا آ تو چکے محفل میں اُس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعداء ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

...تمہارے حُسن کے نام!

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لئے دِل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دِلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حُسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اِک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اَے خاک نشینو! اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اَے ظُلم کے ماتو لب کھولو، چُپ رہنے والو چُپ کب تک
کچھ حشر تو اُن سے اُٹھے گا، کچھ دُور تو نالے جائیں گے

دو عشق

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اَے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایّام
وہ پھُول سی کھِلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دِل سا دھڑکتا ہُوا اُمّید کا ہنگام

اُمّید، کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدّر

اِس بام سے نکلے گا تِرے حُسن کا خورشید
اس کنج سے پھُوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اِس در سے بہے گا تِری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھُولے شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دِن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھُول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سِینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں بانہیں

(٢)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رُخسار کے خم میں، کبھی کاکل کی شکن میں

اِس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پُورے کیے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا، ہر اِک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جُنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی، آوازِ جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھُول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اِس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزُری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رُسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دُشنام
چھُوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دِل
ہر داغ ہے اس دِل میں بجُز داغِ ندامت

نوحہ

مُجھ کو شکوہ ہے مِرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مِری عُمرِ گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا اور مِرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہُوا خوں رنگِ گلاب
کیا کروں بھائی یہ اعزاز، مَیں کیوں کر پہنوں؟
مجھ سے لے لو مِری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے، لو مان لو اِک یہ بھی سوال!
آج تک تُم سے مَیں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آ کے لے جاؤ تُم اپنا یہ دَمکتا ہُوا پھُول
مُجھکو لوٹا دو مری عُمرِ گزشتہ کی کتاب

ایرانی طلبہ کے نام

(جو امن و آزادی کی جدّ و جہد میں کام آئے)

"یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جوان ہیں ارضِ عجم!
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیئے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم

ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟"

"اے پوچھنے والے پردیسی
یہ طفل و جواں
اس نور کے نورس موتی ہیں
اُس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صُبحِ بغاوت کا گُلشن
اَور صبح ہوئی من من، تن تن،
اِن جسموں کا چاندی سونا
اِن چہروں کے نیلم، مرجاں
جگ مگ، جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے چمن چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں، مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و مال
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں، کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لُٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

اہلِ قفس کی صُبحِ چمن میں کھُلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں!

نثار میں تری گلیوں پہ ...

نثار میں تری گلیوں پہ اَے وطن کہ جہاں — چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نِکلے — نظر چُرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لئے اَب یہ نظمِ بست و کُشاد
کہ سنگ[۱] و خِشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظُلم کے دستِ بہانہ جُو کیلئے — جو چند اہلِ جُنوں تیرے نام لیوا ہیں!
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدّعی بھی، مُنصف بھی — کِسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

مگر گزارنے والوں کے دِن گُزرتے ہیں
ترے فراق میں یُوں صبح و شام کرتے ہیں

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دِل یہ سمجھا ہے — کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے — کہ اب سحر ترے رُخ پر بِکھر گئی ہو گی

غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

---

۱ سنگ را بستند و سگاں را گشادند (شیخ سعدیؒ)

یُونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظُلم سے خلق　　نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی رِیت نئی
یُونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھُول　　نہ اُن کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جِیت نئی

اِسی سبب سے فلک کا گِلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دِل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے　　یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا　　یہ چار دن کی خُدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تُم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ اِنہیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پَری

پھر دُنیا والوں نے تُم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹّی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بِلّوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

نا داری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے؟

شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اِس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی!

یہ ساغر شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دِل کی گزر کب ہوتی ہے
اِک بخیہ اُدھیڑا، ایک سِیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے؟

اِس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں — جو آنکھ اُٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں — ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی — دُکانیں خالی ہوتی ہیں؟
یاں پربت پربت ہیرے ہیں — یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اِس دولت پر — پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو — نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں، جو لڑ بھڑ کر — یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی — ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رَن پڑتا ہے — نِت بستی بستی، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں — ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں — وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں — وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر — اِس بازی میں بَد جاتے ہیں
اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو — اِس رَن سے بُلاوے آتے ہیں

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یُوں صبا پاس سے گزُرتی ہے
جیسے کہہ دی کِسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نِگار
شانۂ بام پر دَمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھُل گئی ہے آبِ نجُوم
نور میں گھُل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں، جس طرح دِل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دِل سے پیہم خیال کہتا ہے

اتنی شیریں ہے زندگی اِس پَل
ظُلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بُجھا بھی چُکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے"
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہہِ جام اُتر آئی ہے
عکسِ جاناں کو وداع کر کے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھِلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سُنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے اِن چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رُخِ محبوب کا غم

دُور نوبت ہوئی پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چُور صدائیں جاگیں
دُور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دُور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دُور اُترا کسی تالے کے جگر میں خنجر
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کُناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں اُمید کے جلتے ہوئے تیر

(ناتمام)

یاد

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھِل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سُلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور، اُفق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دِلدار نظر کی شبنم

اِس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں رکھّا ہے
دِل کے رُخسار پہ اِس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دِن، آ بھی گئی وصل کی رات

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یُوں ہے کہ ہر اِک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے

ہاں بادہ کشو! آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اَب سیر کے قابل روشِ آب و ہَوا ہے

اُمڈی ہے ہر اِک سمت سے اِلزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صُراحی
ہر کاسۂ مَے زہرِ ہلاہل سے سِوا ہے

ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے

اس جذبۂ دِل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صِلا ہے
اُس حُسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گُلستاں ہے ترا رُوئے بہاریں
ہر پھُول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے

ہر بھیگی ہوئی رات تری زُلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سُورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنّا ترے قدموں کی صَدا ہے

تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے

زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

"مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

سفر نامہ

(۱)

یُوں گُماں ہوتا ہے بازو ہیں کروڑوں میرے
اور آفاق کی حد تک مِرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن، دشت و چمن کی حد ہے

میرے کِیسے میں ہے راتوں کا سِیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صُبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خُدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کُن فَیَکُوں

(۲)

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا!
اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بُجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر، نہ کسی آنگن میں

وہم، منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا
اَب، کوئی جنگ نہ ہوگی مے و ساغر لاؤ
خُوں لُٹاتا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص، کوئی رقصِ صبا کی صُورت
مطربا! کوئی غزل، رنگِ حنا کی صُورت

غزل

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہُوا ہے لبالب ہر اِک نگاہ کا جام

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک رُوئے حسیں، ہو چلا ہے بیشِ حسیں

مِلے کچھ ایسے، جُدا یُوں ہوئے، کہ فیضؔ اَب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گُل ہے، داغ نہیں

جشن کا دِن

جُنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دِن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دِن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سِلاؤ کہ جشن کا دِن ہے

تنک مزاج ہے ساقی، نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دِن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دِن
ہر اِک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دِن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دِن ہے

وہ شورشِ غمِ دِل جس کی لے نہیں کوئی!
غزل کی دُھن میں سُناؤ کہ جشن کا دِن ہے

شام

اِس طرح ہے کہ ہر اِک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اُجڑا ہُوا بے نُور پُرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اِک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ مَلے، ماتھے پہ سیندور مَلے
سرنگوں بیٹھا ہے چُپ چاپ نہ جانے کب سے
اِس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یُوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پَیوست ہے یُوں دامنِ شام
اَب کبھی شام بُجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اَب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

آسماں آس لئے ہے کہ یہ جادُو ٹُوٹے
چُپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھُوٹے
دے کوئی سنکھ دُہائی، کوئی پائل بولے
کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

تُم یہ کہتے ہو اَب کوئی چارہ نہیں

تُم یہ کہتے ہو وُہ جنگ ہو بھی چُکی
جس میں رکھا نہیں ہے کِسی نے قدم
کوئی اُترا نہ مَیداں میں، دُشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علَم
مُنتشِر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دُشمنوں کا پتا دے سکا
تُم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم
تُم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں
جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگِ ستم، بارِ کُہسارِ غم
جس کو چُھو کر سبھی اِک طرف ہو گئے

بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو! کوئے جاناں کی نامہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اَب نہ آئے گی کیا؟ اب کِھلے گا نہ کیا
اُس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار؟
اِس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا
شورِ آوازِ حق، نعرۂ گیرودار؟

شوق کا امتحاں جو ہُوا سو ہُوا
جسم و جاں کا زیاں جو ہُوا سو ہُوا
سُود سے پیشتر ہے زیاں اَور بھی
دوستو! ماتمِ جسم و جاں اَور بھی
اَور بھی تلخ تر امتحاں اَور بھی

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بُلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گِنو سب داغ دِل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شب گیر بسم اللہ

سِتم کی داستاں، کُشتہ دِلوں کا ماجرا کہیئے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیئے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیئے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
اِن کا دم ساز اپنے سِوا کون ہے؟
شہرِ جاناں میں اَب باصفا کون ہے؟
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے؟

رختِ دِل باندھ لو دلفگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

قیدِ تنہائی

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نوُر کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہُوا دَرد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جُدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دِل میں بھری اپنی صبوحی مَیں نے
گھول کر تلخئ دیروز میں اِمروز کا زہر
دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نوُر کی لہر
آنکھ سے دُور کِسی صبح کی تمہید لئے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صوُرت
عدم آبادِ جُدائی میں مُسافر صوُرت
بے خبر گزُری، پریشانئ اُمّید لئے
گھول کر تلخئ دیروز میں اِمروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی مَیں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق و جمالِ لب و رُخسار کے نام

حمد

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا — شُکر کس طور سے اَدا کیجے
دَولتِ دل کا کچھ شمار نہیں — تنگدستی کا کیا گِلہ کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہُوئے — اُن کو تشویشِ روزگار کہاں؟
درد بیچیں گے، گیت گائیں گے — اِس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل — منتِ لطفِ غمگسار کِسے؟
اشک ٹپکا تو کھِل گیا گلشن — رنجِ کم ظرفیٔ بہار کِسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مُراد — دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی — نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے — جائے تسخیرِ کائنات کرے

دو مرثیے

(۱)

مُلاقات مِری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بُجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مِری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے مُلاقات مِری
اِک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اِک نظر زہر لئے، ایک نظر میں دارُو

دیر سے منزلِ دِل میں کوئی آیا نہ گیا
فُرقتِ دَرد میں بے آب ہُوا تختۂ داغ
کِس سے کہیئے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اَور پھر خود ہی چلی آئی مُلاقات مِری
آشنا مَوت جو دُشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وُہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دِلدار بھی ہے

(۲)

ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہُوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اَب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہو گا
بُجھ گئی دِل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اَب کیا ہو گا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گُلشنِ غم
دوستو! ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں، ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لئے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کُوئے جاناں میں کُھلا میرے لہُو کا پرچم
دیکھئے دیتے ہیں کِس کِس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی یہ صَلا میرے بعد"

کہاں جاؤ گے؟

اَور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے، آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دُنیا کا سماں، ختمِ مُلاقات کا وقت
اِس گھڑی اَے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے؟
اِس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اِس طور کہ پچھتاؤ گے
اِس گھڑی، اَے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے؟

اَور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صُبح

زخم کی طرح ہر اِک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیٔ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیٔ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اِصرار کرے

شہرِ یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفلِ اَبر — جم رہا ہے اَبر کے ہونٹوں پہ خُوں آلُود کف
بُجھتے بُجھتے بُجھ گئی ہے عرش کے حُجروں میں آگ — دھیرے دھیرے بچھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف
اَے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خُوں ناک شام — سر جھکائے جا رہی ہے شہرِ یاراں کی طرف
شہرِ یاراں جس میں اِس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت — شہرِ دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف
اِک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں — اِک طرف چنگھاڑتے ہیں اَہرمن کے طبل و دف
جا کے کہنا اَے صبا، بعد از سلامِ دوستی — آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف
دشتِ شب میں اِس گھڑی چُپ چاپ ہے شاید رواں — ساقیٔ صبحِ طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف

وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار، تری جوششِ جنوں پہ سلام
رہِ یقیں، تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام

مرے وطن، ترے دامانِ تار تار کی خیر
مرے چمن، ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر

رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
ہر اِک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم

نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو

جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دُھوپ کنارا شام ڈھلے
مِلتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دِن، جو آج نہ کل
پل بھر کو اَمر، پل بھر میں دُھواں
اِس دُھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راڑ کرو، کیوں دوش دھرو
کِس کارن جھُوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اِس شام کا سُورج ڈوبے گا
سُکھ سوئیں گے گھر دَر والے
اور راہی اپنی رَہ لے گا

رنگ ہے دِل کا مِرے

تُم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِّ نظر، راہگذر راہگذر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دِل کا مِرے، "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ،
سُرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتّوں کا، خس و خار کا رنگ
سُرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،
کوئی بھیگا ہُوا دامن، کوئی دُکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہُوا آئینہ ہے

اَب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے،
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اِک بار ہر اِک چیز وہی ہو کہ جو ہے،
آسماں حدِّ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

پاس رہو

تُم مرے پاس رہو،
میرے قاتِل، مِرے دِلدار، مِرے پاس رہو،
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہُو پی کے سِیہ رات چلے،
مرہمِ مُشک لئے، نشترِ الماس لئے،
بَین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نِکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نِکلے،
جس گھڑی سِینوں میں ڈوبے ہوئے دِل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رَہ تکنے لگیں
آس لئے،
اَور بچّوں کے بِلکنے کی طرح قُلقُلِ مَے،
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ مَنے،
جب کوئی بات بنائے نہ بنے،
جب نہ کوئی بات چلے،
جس گھڑی رات چلے،
جس گھڑی ماتمی، سُنسان، سِیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مِرے دِلدار، مِرے پاس رہو

منظر

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھُلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہُوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چُپکے سے تَیرا، کسی پتّے کا حُباب
ایک پَل تَیرا، چلا چھوٹ گیا آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خُنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام، صُراحی، ترے ہاتھوں کے گُلاب
جس طرح دُور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مِٹا آہستہ
دِل نے دُہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تُم نے کہا، "آہستہ"
چاند نے جُھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتّوں کا بن

زرد پتّوں کا بن جو مِرا دیس ہے

دَرد کی انجمن جو مِرا دیس ہے

کلرکوں کی افسُردہ جانوں کے نام

کِرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھولے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اُٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دُوسری مالیئے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجّیاں ہو گئی ہے
اُن دُکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچّے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں
منّتوں زاریوں سے بہلتے نہیں
اُن حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بے کار کھِل کھِل کے
مُرجھا گئے ہیں
اُن بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبّت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں
بیواؤں کے نام

"کٹڑیوں"[1] اور گلیوں، محلوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں
کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو
جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بُکا
آنچلوں کی حِنا
چُوڑیوں کی کھنک
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو
پڑھنے والوں کے نام
وہ جو اصحابِ طبل و عَلَم
کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لئے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصُوم جو بھولپن میں
وہاں اپنے ننھّے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے اَنت راتوں کے سائے
اُن اسیروں کے نام

---

[1] کٹڑی کٹڑے کی تصغیر۔ پنجابی میں ملحقہ مکانوں کے احاطے کو کہتے ہیں۔

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں
آنے والے دِنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح
اپنے پیغام پر خُود فِدا ہو گئے ہیں

(نا تمام)

لہُو کا سُراغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہُو کا سُراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سُرخیٔ لبِ خنجر، نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبّا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خونبہا دیتے
نہ دِیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ مُعتبر ہوتا
کِسی عَلم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہُو
کِسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدّعی، نہ شہادت، حساب پاک ہُوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہُوا

یہاں سے شہر کو دیکھو

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیٔ ہوش
ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

غم نہ کر، غم نہ کر

درد تھم جائے گا، غم نہ کر، غم نہ کر
یار لوٹ آئیں گے، دِل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر، غم نہ کر
زخم بھر جائے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
دِن نِکل آئے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
ابر کھُل جائے گا، رات ڈھل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر
رُت بدل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر

بلیک آوٹ

جب سے بے نُور ہوئی ہیں شمعیں
خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا
کھو گئی ہیں میری دونوں آنکھیں
تُم جو واقف ہو بتاؤ کوئی پہچان مری
اِس طرح ہے کہ ہر اِک رگ میں اُتر آیا ہے
موج دَر موج کسی زہر کا قاتل دریا
تیرا ارمان، تری یاد لیئے جان مری
جانے کس موج میں غلطاں ہے کہاں دِل میرا
ایک پَل ٹھہرو کہ اُس پار کسی دُنیا سے
برق آئے مری جانب، یدِ بیضا لے کر
اور مری آنکھوں کے گُم گشتہ گہر
جامِ ظُلمت سے سیہ مست
نئی آنکھوں کے شب تاب گہر
لَوٹا دے
ایک پَل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے

اور بنا دِل مِرا
زہر میں ڈھل کے، فنا ہو کے
کِسی گھاٹ لگے
پھر پئے نذر نئے دیدہ و دِل لے کے چلو
حُسن کی مدح کروں، شوق کا مضموں لکھوں

سپاہی کا مرثیہ

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال،
اَب جاگو میرے لال
تمہری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رَین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں اِن دُکھین اَکھین نے
ڈھیر کیئے ہیں اِتنے موتی
اِتنے موتی جن کی جیوتی
دان سے تمہرا
جگ جگ لاگا
نام چمکنے
اُٹھو اَب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

گھر گھر بِکھرا بھور کا کُندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دُلھنیا، بانکے ویرن
سُونا تمہرا راج پڑا ہے
دیکھو کِتنا کاج پڑا ہے
بَیری بیرا جے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال
اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال
ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

ایک شہر آشوب کا آغاز

اَب بزمِ سُخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اَب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
گھر رہیئے تو ویرانیٔ دِل کھانے کو آوے
رَہ چلئے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوسِ ہوس افسرِ شمشادِ قداں ہے
یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے
اَب صاحبِ انصاف ہے، خود طالبِ انصاف
مُہر اس کی ہے، میزان بہ دستِ دگراں ہے
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

سوچنے دو

(آندرسے وزنیسن سکی کے نام)

اِک ذرا سوچنے دو
اس خیاباں میں
جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گُل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو
اِک ذرا سوچنے دو
یہ بھرا شہر جو اَب وادیٔ ویراں بھی نہیں
اس میں کس وقت کہاں

آگ لگی تھی پہلے
اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل
زہ ہوئی سُرخ شعاعوں کی کماں
کس جگہ جوت جگی تھی پہلے

سوچنے دو

ہم سے اس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جُغرافیہ اَب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوبِ گزشتہ کی طرح
رُوبرو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دِل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بِتانے کے لئے
ہم اب اُس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یُونہی
دل سے مِل آتے ہیں بس رسم نِبھانے کے لئے
دل کی کیا پوچھتے ہو

سوچنے دو

سرِ وادیٔ سینا

(عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رُخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بِینا
اب وقت ہے دیدار کا، دم ہے کہ نہیں ہے؟
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے؟
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا، اَے دیدۂ بِینا!
پھر دل کو مصفّا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اُترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے

لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

(۲)

سنو کہ شاید یہ نورِ صیقل
ہے اُس صحیفے کا حرفِ اوّل
جو ہر کس و ناکسِ زمیں پر
دلِ گدایانِ اجمعیں پر
اُتر رہا ہے فلک سے اب کے
سنو کہ اس حرفِ لم یزل کے
ہمیں تمہیں بندگانِ بے بس
علیم[۱] بھی ہیں، خبیر[۲] بھی ہیں
سنو کہ ہم بے زبان و بے کس
بشیر[۳] بھی ہیں، نذیر[۴] بھی ہیں
ہر اِک اُولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے، کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی، یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر، یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

(۱، ۲، ۳، ۴ یہ الفاظ لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں)

دُعا

آئیے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دُعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سِوا
کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنہیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رُخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دِیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کُفر مِلے، جرأتِ تحقیق مِلے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق مِلے

عِشق کا سرِّ نہاں جان تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

دِلدار دیکھنا

طوفاں بہ دِل ہے ہر کوئی، دِلدار دیکھنا
گُل ہو نہ جائے مشعلِ رُخسار دیکھنا
آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لَو دے اُٹھے نہ طرۂ طرّار دیکھنا
جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ، نہ دیوار دیکھنا
کُوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آگئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا
اس دل نوازِ شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا
خالی ہیں گرچہ مسند و منبر، نگوں ہے خلق
رُعبِ قباء و ہیبتِ دستار دیکھنا
جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
ہر سمت دیکھنا، گُل و گُلزار دیکھنا
پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اِک بار دیکھنا

ہارٹ اٹیک

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے اُلجھنا چاہا
ہر بُنِ مُو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دُور ترے صحن میں گویا
پتا پتا مرے افسردہ لہو میں ڈھل کر
حسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دُکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کُھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پَل آخری لمحہ تری دِلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی، مگر دِل نہ ٹھہرنا چاہا

مرثیے

(۱)

دُور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے تم کب قریب تھے اتنے

اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے

(۲)

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

گرمیٔ رشک سے ہر انجمنِ گُل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا

صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

دیدہ و دِل کو سنبھالو کہ سرِ شامِ فراق
ساز و سامان بہم پہونچا ہے رُسوائی کا

(۳)

کب تک دِل کی خیر منائیں، کب تک رہ دِکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دوگے، کب تک یاد نہ آؤ گے
بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبّت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، اُن کو کیا جتلاؤ گے

فیض دِلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لُٹ جانا بھی
تم اُس حسن کے لُطف و کرم پر کتنے دِن اِتراؤ گے

خورشیدِ محشر کی لَو

آج کے دِن نہ پوچھو، مرے دوستو
دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دِن
کُھل کے ہنسنے کے دِن، گیت گانے کے دِن
پیار کرنے کے دن، دِل لگانے کے دِن

آج کے دِن نہ پوچھو، مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

آج کا دِن زبوں ہے، مرے دوستو
آج کے دِن تو یوں ہے، مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پُرانے نشاں
سب چلے سوئے دِل کارواں، کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں

سے اُٹھے نالۂ الاماں، الاماں!

آج کے دِن نہ پوچھو، مِرے دوستو
کب تمہارے لہو کے دریدہ علَم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اُٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دُھل جائے گا آج کے دِن کا غم
سارے درد و الم، سارے جور و ستم
دُور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لَو
آج کے دِن نہ پوچھو، مِرے دوستو

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے
یا شمع پگھل رہی ہے
پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے
تم ہو کہ مری جاں نکل رہی ہے

جرسِ گل کی صدا

اِس ہوس میں کہ پکارے جرسِ گل کی صدا
دشت و صحرا میں صبا پھرتی ہے یوں آوارہ
جس طرح پھرتے ہیں ہم اہلِ جنوں آوارہ

ہم پہ وارفتگیِ ہوش کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رمّازِ رموزِ غمِ پنہانی ہیں
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہِ دلدار کے زندانی ہیں

جب بھی ابروئے درِ یار نے ارشاد کیا
جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے، چلے آئیں گے
در کھُلا دیکھا تو شاید انہیں پھر دیکھ سکیں
بند ہوگا تو صدا دے کے چلے جائیں گے

فرشِ نومیدیٔ دیدار

دیکھنے کی تو کسے تاب ہے لیکن اب تک
جب بھی اُس راہ سے گزرے تو کسی دکھ کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھلا ہے اَب بھی
اور اس صحن میں ہر سُو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدیٔ دیدار بچھا ہے اَب بھی
اور کہیں یاد کسی دل زدہ بچّے کی طرح
ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھی ہے فریاد کناں
دِل یہ کہتا ہے کہیں اَور چلے جائیں جہاں
کوئی دروازہ عبث وا نہ ہو، بے کار کوئی
یاد فریاد کا کشکول لئے بیٹھی ہو
محرمِ حسرتِ دیدار ہو دیوار کوئی!
نہ کوئی سایۂ گُل، ہجرتِ گُل سے ویراں
یہ بھی کر دیکھا ہے سو بار کہ جب راہوں میں
دیس پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
قافلے قامت و رخسار و لب و گیسو کے

پردۂ چشم پہ یوں اُترے ہیں بے صورت و رنگ
جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ
اور دل کہتا ہے ہر بار، چلو، لوٹ چلو
اس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دُکھ بھی نہ ہو
یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھُلا ہے اب بھی
اور اس صحن میں ہر سُو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدئ دیدار بچھا ہے اب بھی

ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

رہا نہ کچھ بھی زمانے میں جب نظر کو پسند
تری نظر سے کیا رشتۂ نظر پیوند

ترے جمال سے ہر صبح پر وضو لازم
ہر ایک شب ترے در پر سجود کی پابند

نہیں رہا حرمِ دل میں اِک صنمِ باطل
ترے خیال کے لات و منات کی سوگند

مثالِ زینہ و منزل بکارِ شوق آیا
ہر اِک مقام کہ ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھیے
بہارِ گل میں جو پہنچے ہیں شاخِ گل کو گزند

دریدہ دِل ہے کوئی شہر میں ہماری طرح
کوئی دریدہ دہن شیخِ شہر کے مانند

شعار کی جو مداراتِ قامتِ جاناں
کیا ہے فیضؔ درِ دل، درِ فلک سے بلند

حذر کرو مِرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لُبھائے گا میرے لہو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اُس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہرِ ہلاہل بھَرا ہے نس نس میں
جسے بھی چھیدو ہر اک بوند قہرِ افعی ہے
ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مُہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مِرا تن وہ چوبِ صحرا ہے

جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو وسمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دِل لہو کا پیاسا ہے

تہ بہ تہ دل کی کدورت

تہ بہ تہ دل کی کدورت
میری آنکھوں میں اُمنڈ آئی تو کچھ چارہ نہ تھا
چارہ گر کی مان لی
اور میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا
مَیں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا

اور اب ہر شکل و صورت
عالمِ موجود کی ہر ایک شَے
میری آنکھوں کے لہو سے اِس طرح ہم رنگ ہے
خورشید کا کُندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صُبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو
ہر شجر مینارِ خُوں، ہر پھُول خُونیں دیدہ ہے
ہر نظر اِک تارِ خُوں ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اُس کا سُرخ رنگ

جذبۂ شوقِ شہادت، درد، غیظ و غم کا رنگ
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت کا، شب کا، موت کا
ہر رنگ کے ماتم کا رنگ
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
جس سے وضو
کر لیں تو شاید دُھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

یار اغیار ہو گئے ہیں

یار اغیار ہو گئے ہیں،
اور اغیار مُصر ہیں کہ وہ سب
یارِ غار ہو گئے ہیں،
اب کوئی ندیم باصفا نہیں ہے
سب رند شراب خوار ہو گئے ہیں

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صہبا کو تہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطرِ منزل ٹھہر جائے

خمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے

نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئنہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

رسول حمزہ کے افکار

مَیں تیرے سپنے دیکھوں

برکھا برسے چھت پر، مَیں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر، مَیں تیرے سپنے دیکھوں
صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں
کوئل دھوم مچائے، میں تیرے سپنے دیکھوں
آئے اور اُڑ جائے، میں تیرے سپنے دیکھوں
باغوں میں پتّے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں
شبنم کے موتی دہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں
اس پیار میں کوئی دھوکا ہے
تو نار نہیں کچھ اَور ہے شے
ورنہ کیوں ہر ایک سمے
مَیں تیرے سپنے دیکھوں

بھائی

آج سے بارہ برس پہلے بڑا بھائی مرا

اسٹلین گراڈ کی جنگاہ میں کام آیا تھا
تیری ماں اب بھی لئے پھرتی ہے پہلو میں یہ غم
جب سے اب تک ہے وہی تن پہ ردائے ماتم
اور اس دکھ سے مری آنکھ کا گوشہ تر ہے
اب مری عمر بڑے بھائی سے کچھ بڑھ کر ہے

داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی
اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلّے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آبا کہ تھے نامحرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

آرزو —

مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے اٹھ کے آسکوں
ترے در پہ آکے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضور میں آرہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم میں پھر ایک بار روانہ ہوں

سالگرہ —

شاعر کا جشنِ سالگرہ ہے، شراب لا،
منصب، خطاب، رُتبہ انہیں کیا نہیں مِلا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدُوح نے کوئی
مصرع کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

ایک چٹان کے لئے کتبہ —

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بُزدلی نے جنّت کی تھی

تیرگی جال ہے —

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نُور
اِک شکاری ہے دِن، اِک شکاری ہے رات
جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دُور
مچھلیوں کی طرح ابنِ آدم کی ذات
جگ سمندر ہے ساحِل پہ ہیں ماہی گیر
جال تھامے کوئی، کوئی بھالا لئے
میری باری کب آئے گی کیا جانئیے
دِن کے بھالے سے مجھ کو کریں گے شکار
رات کے جال میں یا کریں گے اسیر؟

نسخۂ اُلفت میرا —

گر کسی طور ہر اِک اُلفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رُخِ جاناں نہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
طول میں طولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ اُلفت میرا
اس سبب سے کہ ہر اِک لمحۂ فُرصت میرا

بدل یہ کہتا ہے کہ ہو قربتِ جاناں میں بسر

فنڈ کے لئے سفارش

فنڈ والوں سے گزارش ہے کہ کچھ صدقۂ زر
سائلِ محوّلہ بالا کو ملے بارِ دگر
پوچ لکھتے ہیں جو وہ لکھتے ہیں، تسلیم، مگر
اُن کی اولاد و اعزّاء کو نہیں اس کی خبر
آل بیہودہ نویساں کے لئے نانِ جویں
ٹالسٹائے کے گھرانے سے اہم کم تو نہیں

ہم نے دیکھا ہے

ہم نے دیکھا ہے میگساروں کو
پی کے اور جی کے آخرش مرتے
جو نہیں پیتے موت کو اُن سے
کس نے دیکھا ہے درگزر کرتے

مردِ دانا

مردِ دانا پی کے احمق سے کبھی بدتر ہوا
اور کبھی برعکس بھی اس کے ہُوا، اکثر ہوا

غزلیات

حُسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم
کون جانے کسی کے عشق کا راز

تیری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گُم شدہ آواز

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

تُو ہے اور اِک تغافلِ پیہم
مَیں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیٔ اُمید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

عشق منت کشِ قرار نہیں
حُسن مجبورِ انتظار نہیں

تیری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مَے باندازۂ خمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسم دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں مَیں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیضؔ زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہُوا گر وفا شعار نہیں

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

دِل رہینِ نیاز ہو جائے — بے کسی کارساز ہو جائے

منتِ چارہ ساز کون کرے؟ — درد جب جاں نواز ہو جائے

عِشق دِل میں رہے تو رُسوا ہو — لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لُطف کا انتظار کرتا ہُوں — جَور تا حدِّ ناز ہو جائے

عُمر بے سُود کٹ رہی ہے فیضؔ

کاش افشائے راز ہو جائے

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے

جو، اِن کی مختصر رُوداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی واں برہمی، کیا جانیئے کیوں ہے؟

نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم اُن کی ادا سمجھے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی

ہم اپنے دِل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رِشتۂ ہستی

مگر یہ درد کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

نہ پوچھو عہدِ اُلفت کی، بس اِک خوابِ پریشاں تھا

نہ دِل کو راہ پر لائے نہ دِل کا مُدّعا سمجھے

ہمّتِ التجا نہیں باقی — ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

اِک تری دید چھن گئی مجھ سے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں باقی
اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ — مَیں نہیں یا وفا نہیں باقی؟
تیری چشمِ الم نواز کی خیر — دِل میں کوئی گِلہ نہیں باقی

ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے — دستِ قدرت کو بے اثر کر دے
تیز ہے آج دردِ دل ساقی! — تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے
جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی — چاکِ دامن کو تا جگر کر دے
میری قسمت سے کھیلنے والے — مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے
لُٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز — کاش وہ اِس طرف نظر کر دے

فیضؔ تکمیلِ آرزو معلوم
ہو سکے تو یُونہی بسر کر دے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے — وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ، خُم و ساغر اُداس ہیں — تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے
اِک فرصتِ گُناہ ملی، وہ بھی چار دِن — دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا! — تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مُسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ — مت پُوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دِگر بھی نہیں
وہ مجھ سے رُوٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حُسن
گدائے عشق کے کاسے میں اِک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لئے اُمیدوار بیٹھا ہُوں
اِک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لئے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

رازِ اُلفت چُھپا کے دیکھ لیا
دِل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دِل لگا کے دیکھ لیا

آس اس در سے ٹوٹتی ہی نہیں
جا کے دیکھا، نہ جا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہُوئے
اُن کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج اُن کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیض تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہگذر میں ہے

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصوّرِ شام و سحر میں ہے

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے، تیری نظر میں ہے

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے

تھی مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی!
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فیضؔ ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگذر سے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِّ نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا

مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی
مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بُوئے سلطانی نہیں جاتی
بجُز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

نصیب آزمانے کے دِن آ رہے ہیں　　قریب اُن کے آنے کے دِن آ رہے ہیں
جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سُنا ہے　　سب اُن کو سُنانے کے دِن آ رہے ہیں
ابھی سے دل و جاں سرِ راہ رکھ دو　　کہ لُٹنے لُٹانے کے دِن آ رہے ہیں
ٹپکنے لگی اِن نگاہوں سے مستی　　نِگاہیں چُرانے کے دِن آ رہے ہیں
صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے　　چمن کو سجانے کے دِن آ رہے ہیں
چلو فیض پھر سے کہیں دِل لگائیں
سُنا ہے ٹھکانے کے دِن آ رہے ہیں

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی　　شُکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے　　تجھ کو چاہا تو اَور چاہ نہ کی
تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں　　دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی
تھے شبِ ہجر، کام اَور بہت　　ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں　　ہم لوگ سُرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ　　جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں
اُٹھ کر تو آ گئے ہیں، تری بزم سے مگر　　کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں
ہر اِک قدم اجل تھا، ہر اِک گام زندگی　　ہم گھوم پھر کے کُوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو فیضؔ جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سُخن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اَب کوئی، نہ منزل، فرازِ دار و رَسن سے پہلے
نہیں رہی اَب جنُوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب اُن کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے
غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو، کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے
اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دِل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی
جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی
دِل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہمسفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حُسنِ یار کرتے رہے
خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اِسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
نہیں شکایتِ ہجراں کہ اِس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دِل استوار کرتے رہے
وہ دِن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے
ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سُخنِ راز دار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی — حدیثِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے رہے

اُنہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

بات بس سے نکل چلی ہے — دِل کی حالت سنبھل چلی ہے
اب جنُوں حد سے بڑھ چلا ہے — اب طبیعت بہل چلی ہے
اشک خوناب ہو چلے ہیں — غم کی رنگت بدل چلی ہے
یا یُونہی بُجھ رہی ہیں شمعیں — یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے
لاکھ پیغام ہو گئے ہیں — جب صبا ایک پل چلی ہے
جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی — شوخیٔ رنگِ گلستاں ہے وہی
سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی — جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی
اب جہاں مہرباں نہیں کوئی — کوچۂ یار مہرباں ہے وہی
برق سو بار گر کے خاک ہُوئی — رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی
آج کی شب وصال کی شب ہے — دل سے ہر روز داستاں ہے وہی
چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں، جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اِس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام ونسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دُشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جُرم تو نہیں
شوقِ فضول و اُلفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدّعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اَے جانِ جاں، یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایّام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات، فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرودِ درد کا ہنگام ہی تو ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نَو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گُلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خُدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صُبح ترے کُنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکُل سے مُشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رِشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گُزری سو گُزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنُوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مَقام، فیضؔ! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کُوئے یار سے نکلے تو سُوئے دار چلے

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حِصّے کی، اب جام میں کم تر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اَے دِل، پتّھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خُو ڈالو، کب خُوئے سِتم گر جاتی ہے

بیداد گروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں، خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں، فریاد جو دَر دَر جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رَہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کُوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھِلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہِ گزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائیگی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اَب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو! کبھی اُن کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اِک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیضؔ تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

ہوسِ مطرب و ساقی میں پریشاں اکثر
ابر آتا ہے کبھی ماہِ تمام آتا ہے

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

اَب بھی اعلانِ سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغِ دل کرکے فروزاں سرِ شام آتا ہے

(ناتمام)

صبح کی آج جو رنگت ہے، وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لئے مشعلِ رخسار ہے کون

رات ڈھلکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پُوچھو آج بکھرائے ہوئے زُلفِ طرحدار ہے کون
پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک جانیے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون

(ناتمام)

تری اُمید ترا انتظار جب سے ہے نہ شب کو دِن سے شکایت، نہ دِن کو شب سے ہے
کِسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم گِلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے
ہُوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے
اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھُول ہے تو کھِلے طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے
کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رُکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنواں وصال کے سے
نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی،
وہ جب مِلے ہیں تو اُن سے ہر بار کی ہے اُلفت نئے سرے سے
بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سُبک تر، کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دُنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے
تمہیں کہو رِند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا

یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اُٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں اُبھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو، اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

شفق کی راکھ میں جل بُجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے، نہ دن کو ابر آئے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

(ناتمام)

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو
بزمِ اہلِ طرب کو شرماؤ
بزمِ اصحابِ غم کی بات کرو
بامِ ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو
ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم، یا کرم کی بات کرو
خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو
ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو

جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو

(نذرِ سودا)

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
"ذکرِ مُرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں"
قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں
یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

گویا اس سوچ میں ہے، دِل میں لہو بھر کے گُلاب — دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں
ہے فقط مرغِ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں

گرانیٔ شبِ ہجراں دو چند کیا کرتے — علاجِ دردترے دردمند کیا کرتے
وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دِل کے — یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے
جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کُو بکُو دلبر — اِنہیں پسند، اُنہیں ناپسند کیا کرتے
ہمیں نے روک لیا پنجۂ جنُوں ورنہ — ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے
جنہیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے — وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے
گلُوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لَوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

وہیں ہیں دل کے قرائن تمام کہتے ہیں — وہ اِک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں
تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں! — نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں
یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ — یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں
پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید — گراں ہے اَب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں
فقیہِ شہر سے مَے کا جواز کیا پُوچھیں — کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں
نوائے مُرغ کو کہتے ہیں اَب زیانِ چمن — کھِلے نہ پھُول، اسے انتظام کہتے ہیں
کہو تو ہم بھی چلیں فیضؔ، اب نہیں سرِ دار — وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام، کہتے ہیں

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

(ق)

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
اِن دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اونچا ہے اُسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

دِل میں اَب یُوں ترے بھُولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

ایک اِک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لَے تیز کرو
سُوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں اِحسان اُٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

اَور کچھ دیر نہ گزرے، شبِ فرقت سے کہو
دِل بھی کم دُکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اب وہی حرفِ جنُوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بُتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سُبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

اِک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دِل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیّاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بُوئے گُل ٹھہری نہ بُلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گُلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے

ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمُر کے ہر ورق پہ دِل کی نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یُوں روز انقلاب آئے

جل اُٹھے بزمِ غیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

اِس طرح اپنی خامشی گُونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے

فیضؔ تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

(نذرِ غالب)

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کُوئے بُتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی، جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں، گرچہ بادہ رکھتے ہیں

تری نظر کا گِلہ کیا، جو ہے گِلہ دل کا
تو ہم سے ہے کہ تمنّا زیادہ رکھتے ہیں

نہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دِل کُشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیضؔ ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں

تیری صُورت جو دِل نشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

حُسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

صُبحِ گُل ہو کہ شامِ مے خانہ
مدح اُس رُوئے نازنیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکرِ دوزخ، بیانِ حُور و قصُور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے
کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے
اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے
فیضؔ اوجِ خیال سے ہم نے
آسماں سندھ کی زمیں کی ہے

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کُنجِ قفس بہاراں
آنکھوں میں درد مندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں
مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
رُوئے سخن ہمیشہ سُوئے جگر فگاراں
ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زُہد کر لے
سُوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں
شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں
ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اِک روز ابرو باراں
آئے گی فیضؔ اِک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گُساراں

قرضِ نگاہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثارِ راہِ وفا کر چکے ہیں ہم
کچھ امتحانِ دستِ جفا کر چکے ہیں ہم
کچھ اُن کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم
اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

دیکھیں، ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی — کوئے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم
اب اپنا اختیار ہے چاہے جہاں چلیں — رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم
اُن کی نظر میں کیا کریں، پھیکا ہے اَب بھی رنگ — جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

کچھ اپنے دِل کی خُو کا بھی شکرانہ چاہیئے
سَو بار اُن کی خُو کا گِلہ کر چکے ہیں ہم

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بُجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بُجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بُتاں میں، چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بُجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اَب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بُجھ گئے ہیں

قریب آ، اَے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اِس دَم!
کہ دل پہ کِس کِس کا نقش باقی ہے کون سے نام بُجھ گئے ہیں

بہار اَب آکے کیا کرے گی، کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دِل تہِ دام بُجھ گئے ہیں

بے دَم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے — تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے — خونِ دلِ وحشی کا صِلہ کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے — منصف ہو تو اب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی — ہاں نغمہ گرو، سازِ صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک — دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیِ دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم — ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم — سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں — وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں — نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی!
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن، یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہو گی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہو گی

کب جان لہو ہو گی، کب اشک گہر ہو گا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہو گی

کب مہکے گی فصلِ گل، کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہو گی، کب شامِ نظر ہو گی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے، تجھ کو تو خبر ہو گی

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غم زدوں کو قرار آ گیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آ گئی، جیسے پیغامِ دیدارِ یار آ گیا
جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم، رو برو پھر سرِ رہگزار آ گیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آ گیا
رت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک امڈے کہ ابرِ بہار آ گیا
خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے

محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پہ نکھار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیض کیا جانئے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر

مے کشوں پر ہُوا محتسب مہرباں، دلفگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح — فصلِ گُل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں — ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ — پُر ہُوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گُم گشتہ — بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل — بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں

دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا — جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لُٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو — جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو — کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھُلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی — جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے — رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے
ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت در بدری نے
تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے
مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیضؔ کبھی بخیہ گری نے

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں!
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں
سینے پہ ہاتھ ہے، نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں
کب تک سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں
ہمدم حدیثِ کوئے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں
آشفتہ سر ہیں محتسبو، منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ
سایۂ چشم میں حیراں رخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ
بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے، اپنے لہُو کے دم سے — دِل نے لے بدلی تو مدھم ہُوا ہر ساز کا رنگ

اِک سخن اَور کہ پھر رنگِ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

کِس حرف پہ تُو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غمّاز کیا
اعلانِ جُنوں دِل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا
سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لَے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دِل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا
بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اس ہاتھ پہ سر، اس کف پہ جگر
یُوں کوئے صنم میں وقتِ سفر، نظّارۂ بامِ ناز کیا
جس خاک میں مِل کر خاک ہوئے وہ سُرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خُوں چھِڑکا، ہم رنگِ گُلِ طنّاز کیا
لو وصل کی ساعت آ پہنچی، پھر حُکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

کئی آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے — شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے
وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حُسن کرتے — تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے
وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے — وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے
ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرار شرحِ غم سے — کہ ہیں دل میں وہ گِلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

یہ ندیمِ یک دو ساغر، مرے حال تک نہ پہنچے
کوئی بارِ جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا

چلو فیضؔ دل جلائیں، کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح وِرد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلا کریں!
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن، میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اِک کرن، جو لگن اُس آئینہ رُو کی ہے

شرحِ بے دردیٔ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا!
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

پھر وہ پروانے جنہیں اذنِ شہادت نہ مِلا
پھر وہ شمعیں کہ جنہیں رات نہ ہونے پائی

پھر وہی جاں بلبی لذّتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

پھر دمِ دید رہے چشم و نظر دید طلب　　پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی
پھر وہاں بابِ اثر جانیے کب بند ہوا　　پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی
فیض سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری
ایک بھی روزِ مکافات نہ ہونے پائی

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی　　جس بار خزاں آئی، سمجھے کہ بہار آئی
آشوبِ نظر سے کی ہم نے چمن آرائی　　جو شے نظر آئی، گُل رنگ نظر آئی
اُمیدِ تلطّف میں رنجیدہ رہے دونوں　　تُو اور تری محفل، میں اور مری تنہائی
واں مِلّتِ بوالہوساں اور شورِ وفاجوئی　　یاں خلوتِ کم سُخناں اور لذّتِ رُسوائی
یک جان نہ ہو سکئے، انجان نہ بن سکئے　　یوں ٹوٹ گئی دِل میں شمشیرِ شناسائی
اِس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اَے چشمِ تماشائی

قطعات و اشعار

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

دِل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج؟

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دِل ہے اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

فضائے دِل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اُترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدّعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

(شعر)

ادائے حُسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

نہ آج لُطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وِصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

فکرِ سُود و زیاں تو چھُوٹے گی
منّتِ این و آں تو چھُوٹے گی

خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے رنگِ رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر تیری زلفوں کی آبشار گری

تمام شب دلِ وحشی تلاش کرتا ہے ہر اک صدا میں ترے حرفِ لطف کا آہنگ
ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر تمہاری یاد سے دِل ہم کلام رہتا ہے
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

کھلے جو ایک دریچے میں آج حسن کے پھول تو صبح جھوم کے گلزار ہو گئی یکسر
جہاں جہاں بھی گرا نور اُن نگاہوں سے ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

متاعِ لوح و قلم چھن گیا تو کیا غم ہے کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے اِن اجنبی بہاروں میں جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

صبا کے ہات میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی — ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دِل کو گُماں
وہ ہات ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں — کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں — بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھئے کس کس پہ ہے ثابت — وہ سارے خطا کار سرِ دار کھڑے ہیں

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہُوں — نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے — مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

ہمارے دم سے ہے کُوئے جنوں میں اَب بھی خجل — عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سُنّتِ منصُور و قیس زندہ ہے — ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کج کُلہی

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پہ تمہاری — ہر سادہ ورق جس سخنِ کُشتہ سے خُوں ہے
شاید کبھی اُس گیت کا پرچم ہو سرافراز — جو آمدِ صرصر کی تمنّا میں نگوں ہے
شاید کبھی اُس دل کی کوئی رگ تمہیں چُبھ جائے — جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

یہ خُوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خُوشبو — کس راہ کی جانب سے صَبا آتی ہے دیکھو
گُلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہُوا آباد — کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

بیچارے میکدوں کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنالی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریٔ واعظ کو ہمیں باقی ہیں، ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشّاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں اِن مہینوں میں

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
اُمیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم، کوئی پھول کھِلے یا نہ کھِلے

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات اِن دنوں
کھلتی ہے صبح گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر

ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا — دِل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی — اے اہلِ مصر، وضعِ تکلّف تو دیکھئے
انصاف ہے، کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر — اِک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

ان دنوں رسم ورہِ شہرِ نگاراں کیا ہے — قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے، کہ مقتل ہے، کہ میخانہ ہے — آج کل صورتِ بربادئ یاراں کیا ہے

زنداں زنداں شورِ اناالحق، محفل محفل قُلقُلِ مے
خونِ تمنّا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم ماتم شہر بہ شہر

دیدہ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے — کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُنکے حضور — دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

دیوارِ شب اور عکسِ رُخِ یار سامنے — پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا
پھر وضعِ احتیاط سے دُھندلا گئی نظر — پھر ضبطِ آرزو سے بدن ٹوٹنے لگا

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اک سخن مطربِ زیبا کہ سلگ اٹھے بدن
اک قدح ساقیٔ مہوش جو کرے ہوش تمام

ذکرِ صبحے کہ رُخِ یار سے رنگیں تھا چمن
یادِ شبہا کہ تنِ یار تھا آغوش تمام

متفرقات

غزل

وقفِ اُمیدِ دیدِ یار ہے دِل
فصلِ گُل اَور سوگوار ہے دِل

جانتا ہے کہ وہ نہ آئیں گے
پھر بھی مصروفِ انتظار ہے دِل

وجہِ رنج و الم سہی لیکن
خوابِ اُلفت کی یادگار ہے دِل

آپ مجُرمِ جفا نہ بنیں
ہم نے مانا گناہ گار ہے دِل

فیضؔ، انجامِ عاشقی معلوم
اِس قدر ہے کہ بے قرار ہے دِل

نذر

طربِ زارِ تخیّل، شوقِ رنگیں کار کی دُنیا
مرے افکار کی جنّت، مرے اشعار کی دُنیا

شبِ مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی
تمہاری دِل نشیں آواز میں آرام کرتی ہے
بہار آغوش میں بہکی ہوئی رنگینیاں لے کر
تمہارے خندۂ گلریز کو بدنام کرتی ہے
تمہاری عنبریں زُلفوں میں لاکھوں فتنے آوارہ
تمہاری ہر نظر سے سینکڑوں ساغر چھلکتے ہیں
تمہارا دِل حسیں جذبوں سے یُوں آباد ہے گویا
شفق زارِ جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں
جہانِ آرزو! یہ بے رُخی دیکھی نہیں جاتی
کہ شوقِ دید کو تُم اِس طرح بے سُود کر ڈالو
بہشتِ رنگ و بُو! رعنائیاں محدود کر ڈالو
نحیف آنکھوں سے اتنی دلکشی دیکھی نہیں جاتی

پیامِ تجدید

عہدِ اُلفت کو مُدّتیں گزریں　　دورِ راحت کو مُدّتیں گزریں
مثلِ تصویرِ یاس ہے دُنیا　　ہائے کتنی اُداس ہے دُنیا
پھر تجھے یاد کر رہا ہُوں مَیں

کتنے بے کیف روز و شب ہیں کہ تُو　　وجہِ تزئینِ مہر و ماہ نہیں
حسرتِ دید کھو چکا ہُوں مَیں　　آہ مَیں اَور تیری چاہ نہیں
اِس تصنّع سے تھک گیا ہُوں مَیں

آ، مجھے پھر شُمار میں لے لے　　یادِ دوشینہ مت جگا پیاری
بے وفائی کا ذکر رہنے دے　　میرے شِکوؤں کی فکر رہنے دے
آ، گزشتہ کو بھول جا پیاری　　آ، مجھے پھر کنار میں لے لے
دردِ عہدِ فراق رو ڈالوں
دِل کے دیرینہ داغ دھو ڈالوں

واپس لوٹ آئی ہے بہار

جاگ اُٹھیں سرسوں کی کرنیں
پودے سنورے، سبزہ بکھرا

سہمے سے افسردہ چہرے
جور و ستم ویسے کے ویسے

غم کے تپتے صحراؤں میں
پا بے جاں ہاتھوں سے ہٹ کر

واپس لوٹ آئی ہے بہار
دُھل گئے پھولوں کے رُخسار
واپس لوٹ آئی ہے بہار
اُن پر غم کی گرد وہی
صدیوں کے دُکھ درد وہی
اور وہی برسوں کے بیمار
واپس لوٹ آئی ہے بہار
دُھندلی سی راحت کی چمک
سمٹے سے آنچل کی جھلک
دل کی شکستوں کے انبار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

قصیدہ

(۱)

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر — گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اِک لفظ اِدھر نطق سے نکلا — واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر
گرمی بھی ہے ٹھنڈک بھی روانی بھی سکوں بھی — تاثیر کا کیا کہیئے ہے تاثیر ہی تاثیر
اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی — اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر
اطرافِ وطن میں ہوا حق بات کا شہرہ — ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہوئی تشہیر
روشن ہوئے اُمید سے رُخ اہلِ وفا کے — پیشانیٔ اعداء پہ سیاہی ہوئی تحریر

(۲)

حُریتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر — خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
کچھ ننگ نہیں، رنجِ اسیری، کہ پرانا — مردانِ صفا کیش سے ہے رشتۂ زنجیر
کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے — ایمان و یقیں دل میں کئے رہتے ہیں تنویر
معلوم ہے اس کو کہ رہا ہو گی کسی دن — ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر
آخر کو سرافراز ہوا کرتے ہیں احرار — آخر کو گرا کرتی ہے ہر جبر کی تعمیر
ہر دور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا — ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر
ہر دور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی — ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبّیر

(۳)

کرتا ہے قلم اپنے لب و نُطق کی تطہیر
پہنچی ہے سرِ حرفِ دُعا اب مِری تحریر

ہر کام میں برکت ہو ہر اِک عزم میں قوّت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر

ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سِوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر

ہر بات ہو مقبول ہر اِک بول ہو بالا
کچھ اَور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر

ہر دن ہو ترا لُطفِ زباں اور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اَور زیادہ

سہرا

(طاہر نعیم اور یاسمین امتیاز کی شادی پر)

سجاؤ بزم، درِ میکدہ کُشادہ کرو
اُٹھاؤ سازِ طرب، اہتمامِ بادہ کرو
جلاؤ چاند ستارے، چراغ کافی نہیں
یہ شب ہے جشن کی شب روشنی زیادہ کرو

سجاؤ بزم کہ رنج و اَلم کے زخم سِلے
بساطِ لطف و محبّت پہ آج یار مِلے
دُعا کو ہاتھ اُٹھاؤ کہ وقت نیک آیا
رُخِ عزیز پہ سہرے کے آج پھُول کِھلے

اُٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خُوش مُدام رہے
شبِ نشاط و بساطِ طرب دوام رہے
تمہارا صحن منوّر ہو مثلِ صحنِ چمن
اور اس چمن میں بہاروں کا انتظام رہے

تین گیت

(۱)

پنکھی راجہ رے پنکھی راجہ میٹھا بول

جوت جگی ہر من میں

بھنورا گونجے ڈالی جھومے

بستی باڑی بن میں

جوت جگی ہر من میں

ندیا رانی رے

ندیا رانی میٹھا بول

میٹھا بول

گھاٹ لگی ہر ناؤ

رات گئی سکھ جاگا

پائل باندھو ناچو، گاؤ

گھاٹ لگی ہر ناؤ

ندیا رانی میٹھا بول

سندر گوری اے

سُندر گوری میٹھا بول

جیوے رُوپ جوانی
بات کرے تو پھُول کھلیں
اکھیاں ایک کہانی
جیسے دُور سے تارا چمکے
چمکے رُوپ جوانی
جیوے رُوپ جوانی
جوت جگی ہر من میں
پنکھی راجہ میٹھا بول
ندیا رانی ...... سُندر گوری

(۲)

سکھی رہے تیری رات چندا سُکھی رہے تیری رات
دُور رہے چین کی نگری چندا دُور رہے سُکھ کا گاؤں
جانے کیسے راہ کٹے گی ہارے تھک تھک پاؤں
اوٹ میں بیٹھے بیری چندا۔ تھام لے میرا ہاتھ
سُکھی رہے تیری رات ـــــ

تیری دیا سے دیپ جلا ہے اِس پاپن کے دوارے
جانے کیسے بھاگ جگے ہیں بھول گئے دُکھ سارے

من کانپے جی دھڑکے، چندا چھوٹ نہ جائے ساتھ
سُکھی رہے تیری رات ــــ

(۳)

بُجھ گیا چندا، لُٹ گیا گھروا، باتی بُجھ گئی رے
دیّا راہ دِکھاؤ
موری باتی بُجھ گئی رے، کوئی دیپ جلاؤ
رونے سے کب رات کٹے گی ہٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ
کالی رات سے جیوتی لاؤ
اپنے دُکھ کا دیپ بناؤ

ہٹ نہ کرو من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ

شامِ غم

ہر گھڑی عکسِ رُخِ یار لئے پھرتی ہے
کتنے مہ تاب شبِ تار لئے پھرتی ہے

سُن تو لو، دیکھ تو لو، مانو نہ مانو اے دِل
شامِ غم سینکڑوں اقرار لئے پھرتی ہے

ہے وہی حلقۂ موہوم مگر موجِ نسیم
تارِ گیسو میں خمِ دار لئے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن
ہر کلی ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

اقبال

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ ویراں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
فضا کی گود میں چپ تھے ستیز انگیز ہنگامے
خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

سنی واماندہ منزل نے آوازِ درا آخر
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
خود آگاہی سے بدلی قلبِ جاں کی خود فراموشی

عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
زمیں سے نوریاں تا آسماں پرواز کرتے تھے
فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
یہ خاکی زندہ تر تابندہ تر پائندہ تر نکلے

نمود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک ذرّے کو ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
طلسمِ کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

خوابِ پریشاں

ہاں خواہش کے بیمار مِرے تنہا دل نے
اِک خواب سبھی خوابوں کی طرح پیارا دیکھا
لیکن مِرے سب خوابوں کی طرح
یہ خواب بھی بے معنی نِکلا
یہ خواب کہ بن جاؤں گا کسی دن۔
۔ بورڈنگ کا مانیٹر مَیں
حیرت کہ ہُوا ایسا ہی مگر
تھی کِس کو خبر
اِس موڑ پہ آ کے بختِ رسا سو جائے گا
زینوں کی صدا آسیب زدہ
حمام میں غم کی گرد اَٹی
اور ایک نحوست کا پیکر
مینار گھڑی
ہر گھنٹہ کراہی وقت کے لمبے رستے پر
آواز تھکن میں ڈوبی ہوئی
مَیں، گُرمکھ سنگھ سُنتا ہی رہا
سُن سُن کے مگر یہ کہنا پڑا
یہ خواب بھی کتنا مہمل تھا

بچّوں کے لئے

منیزہ کی سالگِرہ

اِک منیزہ ہماری بیٹی ہے — جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے

ہم ہی کب اُس کو پیار کرتے ہیں — سب کے سب اس کو پیار کرتے ہیں

کیسے سب کو نہ آئے پیار اس پر — ہے وہی تو ہماری ڈکٹیٹر

پیار سے جو بھی جی چُرائے گا — وہ ضرور اس سے مار کھائے گا

خیر یہ بات تو ہنسی کی ہے — ویسے سچ مچ بہت وہ اچھّی ہے

پھُول کی طرح اُس کی رنگت ہے — چاند کی طرح اُس کی صُورت ہے

جب وہ خوش ہو کے مُسکراتی ہے — چاندنی جگ میں پھیل جاتی ہے

پڑھنے لکھنے میں خوب قابل ہے — کھیلنے کُودنے میں کامل ہے

عُمر دیکھو تو آٹھ سال کی ہے — عقل دیکھو تو ساٹھ سال کی ہے

پھر وہ گانا بھی اچھّا گاتی ہے — گرچہ تم کو نہیں سُناتی ہے

بات کرتی ہے اس قدر میٹھی — جیسے ڈالی پہ کوک بُلبُل کی

ہاں کوئی اس کو جب ستاتا ہے — تب ذرا غصّہ آ ہی جاتا ہے

پر وہ جلدی سے من بھی جاتی ہے — کب کسی کو بھلا ستاتی ہے

ہے شگفتہ بہت مزاج اُس کا — سارا عمدہ ہے کام کاج اُس کا

ہے منیزہ کی آج سالگرہ ہر طرف شور ہے مبارک کا
چاند تارے دعائیں دیتے ہیں پھول اس کی بلائیں لیتے ہیں
باغ میں گا رہی ہے یہ بلبل تم سلامت رہو منیزہ گل
امی ابا بھی اور باجی بھی آنٹیاں اور بہن بھائی بھی
آج سب اس کو پیارا کہتے ہیں مل کے سب بار بار کہتے ہیں
پھر یونہی شور ہو مبارک کا آئے سو بار تیری سالگرہ
سنو تو کیا سو ہزار بار آئے یوں کہو، بے شمار بار آئے
لائے ہر بار اپنے ساتھ خوشی اور ہم سب کہا کریں یونہی

یہ منیزہ ہماری بیٹی ہے
یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے